ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

ڈاکٹر محمد رحمان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ
ڈاکٹر عظمیٰ نورین
لیکچرار، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
صدیق
لیکچرار، شعبہ اردو، صوابی یونیورسٹی۔

رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی "آشفتہ بیانی میری" سماجی تناظر میں

Dr. Muhammad Rahman *
Assistant Professor Department of Urdu Hazara University Mansehra.
Dr. Uzma Noreen
Lecturer G.C Women University Sialkot.
Saddique
Lecturer Department of Urdu University of Swabi.
***Corresponding Author:** drmrehman75@gmail.com

Rashid Ahmed Siddiqui's Autobiography "Ashifat Bayani Meri" in a Social Context

"Ashfat Bayani Meri" is the autobiography of Rashid Ahmed Siddiqui. He was born in 1894 in a village of Jaunpur district of UP. He lived in Jaunpur till his matriculation. Then he came to Aligarh for higher education. When a college was established in 1912, he was reinstated as a professor. When the university was established, a department of Urdu literature was also established in it and he was made the head of the department. He died in 1977. He was also awarded the Sahitya Academi Award and the Padma Shri for literature and education. His famous works include "Khandan", "Ganj Hai Granmayah" and "Taniyat Wamzahakat". Rashid Ahmed Siddiqui's autobiography "Ashfat Bayani Meri" is actually a

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

commentary on your Aligarh University (MAO College). In it, you have also described different aspects of your life. However, the love for Aligarh and its long mention do not let the rest of your life shine in the eyes of the reader and it feels as if this autobiography is dedicated to Aligarh alone. A special thing about this autobiography is that Rashid Ahmed Siddiqui has also mentioned various personalities in it. While reading this autobiography, the reader goes into the valley of history, the beauty of words and sentences, the decency of language, the skill of using poetry, and many good things at the same time. This also indicates the dark corners of Rashid Sahib's academic life. And there are "funnies".

Key Words: *Rashid Ahmed Siddiqui, "Ashfat Bayani Meri", Jaunpur, UP, Sahitya Academi, "Khandan", "Ganj Hai Granmayah" and "Taniyat Wamzahakat" Aligarh University (MAO College).*

رشید احمد صدیقی ادب میں منفرد طنز و مزاح نگار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن کی مشہور زمانہ کتب "مضامین رشید" اور "حندان" ہیں جن کی وجہ سے اُن کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ اسی طرح وہ ایک نمایاں خاکہ نگار بھی رہے ہیں اور "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" کے ذریعے اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔

رشید احمد صدیقی اپنے مخصوص اسلوب کے حوالے سے خاص الخاص نثر نگار ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں بھی اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ اقبال، غالب، فانی، جگر اور دیگر تنقیدی مضامین پر خوب لکھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ بہترین نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک نمایاں ادیب اپنی زندگی کے واقعات کو اپنے قلم سے لکھ کر داد و تحسین حاصل کرلیتا ہے بالکل اسی طرح رشید احمد صدیقی نے بھی اپنی زندگی کے شب و روز کو ایک یادداشتی روزنامچے آشفتہ بیانی میری "کی صورت میں مرتب کیا۔ یہ آپ بیتی اُن کے پچاس سالہ دور کا احاط کرتی ہے جس میں انھوں نے اپنے بارے میں قارئین ادب کے جملہ سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ تو آیئے اس آپ بیتی کا تجزیہ کرتے چلیں۔

جب کہ مذکور ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنی یہ آپ بیتی قریباً پچاس برس کی عمر لکھی۔ اس آپ بیتی کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں ہمیں اکثر و بیش تر علی گڑھ کا بیان نظر آتا ہے رشید احمد صدیقی کی پیدائش علی گڑھ میں نہیں ہوئی مگر ان کی زندگی کے بہترین شب و روز اسی درس گاہ میں گزرے۔ اس درس گاہ سے رشید صاحب کی محبت اُن کے رگ گ میں بسی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

"علی گڑھ مجھے عزیز ہے۔ اس کی کوتاہیوں کے باوجود اگر وہ قابلِ اعتنا بھی ہوں یقیناً ان عزیزوں اور بزرگوں کو بھی عزیز ہو گا جن کو اس نے اپنے فیض تربیت سے اخلاص و افتخار سے رہنے سہنے اور دوسروں کو پرکھنے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا اور انسانی زندگی جن قیمتی اقدار وروایات کے سہارے نمودار نمود پاتی اور برگ و بار لاتی ہے ان سے آشنا کیا۔ بیالیس سال تک مسلسل جس کو علی گڑھ نے اپنی نعمتوں سے بہرہ مند رکھا ہو علی گڑھ کے بارے میں اس کے تصورات و تاثرات اگر بے ربطی شیرازہ اجزائے "حواس" کی حد تک پہونچے ہوں تو کیا عجب۔"[۱]

رشید احمد صدیقی اردو کی محبت کے دیوانے ہیں۔ انھیں علی گڑھ اس قدر عزیز ہے کہ وہ ہر چیز کی برائی اور اچھائی کے پیمانے کے طور پر اس کا موازنہ علی گڑھ سے ہی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی اپنی اس عادت بد سے بڑی حد تک تنگ ہیں مگر کیا کریں کہ علی گڑھ کا عشق ان کی ذات کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میری تحریروں میں یہ نقص پایا جاتا ہے کہ ان میں علی گڑھ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے ان کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے بھی لگے ہیں۔ اس سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ خود علی گڑھ سے کیوں واقف نہیں! اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے۔"[۲]

رشید صاحب بجائے اس کے علی گڑھ سے عشق پر پچھتائیں، وہ اس "عادت بد" پر فخر کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اا س کو خامی بھی قرار دیتے ہیں۔ اور تو اور اس عشق علی گڑھ کو وہ اردو کے ساتھ منسلک کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان کی نظر میں علی گڑھ سے محبت دراصل اردو سے ہی محبت ہے۔ وہ اس بے ساختہ عشق میں علی گڑھ کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی شامل کر دیتے ہیں۔ وہ خود تو علی گڑھ کے عاشق زاد تو ہیں ہی اوپر سے اس کے بارے میں مختلف توجیہات بھی پیش کرتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی اس آپ بیتی میں ان کے آبائی قصبے "جون پور" کا بھی ذکرِ خیر بقدر مقدار پایا جاتا ہے۔ بقدر مقدار کا مطلب یہ کہ اس میں اپنی تعلیمی زندگی کا ذکر زیادہ ہے اور باقی ذکر کم کم ہی ہے۔ وہ اپنی جنم بھومی (جون پور) کے بارے میں رقم طراز ہیں:

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16
ماخذ تحقیقی مجلہ

"جون پور تاریخی شہر ہے۔ وہاں شاہانِ شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ کئی جید مسجدیں، مزارات اور مقبرے، ایک عالی شان قلعہ، عید گاہ، پل، پختہ سرائے اور کتنے سارے کھنڈر شاہی زمانے کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پُل ہے۔ برسات میں بالضرور طغیانی آتی ہے۔ یہ زمانہ شہر میں تردد اور تفریح دونوں کا ہوتا ہے۔ شہر سے متصل دریا کے کنارے شاہانِ شرقی کا ویران قلعہ کتنا اونچا، مستحکم اور شان دار پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے جس کی دیوار کے ایک رخ پر دریا کا اتار چڑھاؤ ظاہر کرنے کے لیے نمبر لگا دیئے گئے ہیں۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف، اتنی کتابیں یا اخبارات پڑھنے کے لیے نہیں جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوئے شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کبھی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر گم ہو جاتے۔"(۳)

مذکورہ عبارت میں رشید احمد صدیقی اپنے آبائی شہر جون پور کے بارے میں اس کی علمی و ادبی میراث کے بارے میں تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اس شہر کی مختلف عمارات، سرایوں، ریلوے سٹیشن، مزارات اور شاہی مقبروں کے بارے میں خامہ فرسائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان کو اپنی جنم بھومی کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ یہ شہر ہندوستان کی ریاست اتر پردیش میں وقع ہے اور اس کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس سے جون پور شہر کی تہذیب و وضع داری اور رواداری جیسی خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس شہر کے شیعہ گھرانوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"بیش تر مسلمان گھرانے ایسے تھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے۔ پنجہ لڑاتے تھے، نیچپہ باندھتے تھے، علم اٹھاتے تھے، طبل بجاتے، سوز خوانی اور ماتم کرتے، فرینی کباب بیچتے تھے، بٹیر لڑاتے اور کبوتر لڑتے تھے۔ بہ ایں ہمہ سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کرتے کچھ ہوں بیٹھتے سب کے برابر تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16
ماخذ تحقیقی مجلہ

ہر خاندان میں خواہ وہ کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی شاعر، مرثیہ خواں، خوش نویس، پہلوان، پتنگ باز، داستان گو ہوتا۔ بزرگوں کے زمانے کی ایک بیاض ہوتی جس پر خاندان ہی کے کسی اگلے پچھلے سر آوردہ شاعر کا کلام محفوظ ہوتا، جسے صاحبِ خانہ گھر پر مجلس منعقد کر کے بڑے فخر سے اور فن کے جملہ آداب ملحوظ رکھ کر سناتے۔"(۴)

اوپر کے اقتباس سے ایک بات تو واضح ہے کہ رشید احمد صدیقی فنونِ لطیفہ کے حوالے سے چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا علم رکھنے والے ادیب تھے۔ مگر یہ کہ ان کا ہندوستانی تہذیبی مطالعہ بھی منفرد نوعیت کا تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے حوالے سے اپنے مخصوص حوالوں کے لیے مشہور تھے۔ اس لحاظ سے اُن کے اقوال آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ وہ اردو، تاج محل اور غالب کے تکون کے حوالے سے اپنے ایک مشہور جملے میں یوں رقم طراز ہیں:

"مجھ سے اگر کوئی پوچھے مغلیہ حکمرانوں نے ہندوستان کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا، اردو، تاج محل اور غالب۔ کیوں کہ تین تحفے ہندوستانی تہذیب کی نمایاں پیداوار ہیں۔"(۵)

اوپر کا اقتباس رشید احمد صدیقی کی تنقیدی اور تہذیبی مساعی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھیں کس قدر ادراک تھا اس بات کا کہ مغلیہ تہذیب نے ہندوستان کی سرزمین پر جو بھی اثر ڈالا ہو لیکن اردو جیسی زبان، غالب جیسا شعر بے بدل اور تاج محل جیسا عجوبہ دیا۔ رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ اُن کی مخصوص پہچان بن چکا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں اپنے دور کے تعلیمی رجحانات کا بھی ذکر کیا ہے اور موجودہ دور کی کمی اور کوتاہی پر رنج فرماتے ہیں۔ ان کے خیال میں آج کل کے طلبہ فنون لطیفہ اور کلاسیکی روایت سے دور ہونے کی بنا پر ادب سے کافی دور ہو چکے ہیں۔ مزید یہ کہ اقبال کی شاعری پڑھنا اُس وقت کے لوگوں کا عشق تھا جو اب نہیں رہا۔ اردو کے مستقبل کے حوالے سے بھی رشید احمد صدیقی مایوسی کا شکار ہیں۔ اس حوالے سے وہ اردو کی ترویج و ترقی کے حوالے سے اپنی تجاویز دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سر سید احمد خان کی شخصیت اور اُن کی سیاسی و ادبی مساعی کے حوالے سے بھی انھوں نے کئی مضامین میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس حوالے سے اپنی آپ بیتی "آشفتہ بیانی میری" میں لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان جن حالات و حادثات سے دوچار رہے ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے انھوں نے کل ہند نوعیت کی جن تحریکات کو چلایا ان میں غالباً مدرسۃ العلوم

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

علی گڑھ (ایم اے او کالج) ہی ایسا ادارہ تھا جس پر پوری قوم کو پورے طور پر بھروسا تھا۔ جس نے بحیثیت مجموعی قوم کی سب سے منفرد اور دیرپا خدمات انجام دیں اور جس کی خدمات کو متفقہ طور پر تقریباً ہر حلقے میں سراہا گیا۔ جس نے مسلمانوں کی ہر سمت سے تقویت پہنچائی۔ ان کے حوصلے اور عزائم کو پروان چڑھایا اور دور و نزدیک ان کی توقیر بڑھائی۔ اس کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کے نشیب و فراز بھی آئے جن پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن ان کی خدمات کے بیش بہا ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ خالص مذہبی یا نیم مذہبی ادارے پیش نظر نہیں ہیں!

سرسید مغلیہ سلطنت کی تباہی اور غدر کی ہولناکیوں سے برآمد ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت ان صلاحیتوں پر مشتمل تھی جو کہ ایک طرف مٹتے ہوئے عہد کا قیمتی ورثہ اور دوسری طرف اس کی جگہ لینے والے صحت مند تصرفات کی بشارت کہہ سکتے ہیں! وہ ایک ایسے رشتے یا واسطے کی مانند تھے جو ایک عظیم ماضی کو اس کے عظیم تر مستقبل سے منسلک و مربوط رکھتا ہے۔ جس کے بغیر نہ تو کسی قوم کے تہذیبی شعور میں ربط و تسلسل باقی رہتا ہے نہ خود نسلِ انسانی اس منزلت پر فائز رہ سکتی ہے۔ جس کی اس کو بشارت دی گئی ہے!

مدرسۃ العلوم کا قیام انھیں صلاحیتوں کا تقاضہ تھا جس کو سرسید اور ان کے رفقائے کرام نے اپنی تحریر، تقریر، شاعری، شخصیت اور عمل محکم اور مسلسل سے متشکل اور مزین کر دیا۔"(۲)

سرسید سے متعلق یہ خیالات رشید احمد صدیقی کے مختلف مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ سرسید اور ان کے رفقا کی اردو کے حوالے سے کوششوں کو بڑی حد تک سراہتے ہ۔یں کنجوسی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کے عظیم ماضی کی نشاۃ الثانیہ میں انھیں صاحبان کی کوششوں کا دم بھرتے ہیں۔ سرسید احمد خان کی شخصیت مسلمانانِ ہند کے لیے روشن چراغ کی سی تھی جن سے وہ اپنا دامن روشنی سے بھر رہے تھے۔ سرسید کے حوالے سے رشید صاحب کے خیالات یہ ہیں:

"میرا ذاتی خیال کچھ ایسا ہے کہ سرسید نہ تو مذہب کے ایسے کوئی جید عالم تھے، نہ سیاست کے ماہر یا شعر و ادب کے شیدائی، لیکن بقول ایک فاضل کے ایک غیر معمولی صفت ان میں یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر جو لکھنا یا کہنا چاہتے تھے اس کے لیے تمام ضروری معلومات فراہم

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

> کرنے کی انتہائی کوشش کرتے جو مستند کام کرنے والوں کا امتیاز ہے۔ وہ بڑے مخلص، ہمدرد، ذہین، دلیر، دوراندیش، اَن تھک اور نا قابلِ تسخیر تھے۔ ان میں جہاں داری اور جہاں بنی دونوں کی جھلک ملتی ہے جو کبھی ہمارے اسلاف کی صفات تھیں۔ غدر کے بعد جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی شیرازہ بندی کا سوال تھا وہ قائد، امام عہد یا روح عصر یقیناً تھے۔ وہ شاید کسی فن میں یگانہ وروز گار نہ تھے لیکن کتنے یگانہ روز گار ان کے گرد جمع ہو گئے تھے، شاید جمع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان سب کی بیش بہا تخلیقی استعدادوں کو ایک مقصد پر مرکوز کر کے قوم و ملت کے لیے بابرکت بنانا سرسید کی غیر معمولی شخصیت کا فیضان تھا۔ سرسید کو پہچاننے میں ہم نے دیر بھی کی اور ناانصافی بھی۔ اب ان کو ہر موقع پر یاد کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔"(۷)

رشید صاحب چوں کہ علی گڑھ کی محبت میں ہر طرح سے قربانی دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ادارہ سرسید کا تعمیر کردہ ہے اس لیے وہ سرسید کی شخصیت اور خدمات کو ہر سطح پر سراہنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں شخصیت ہر فن میں یکتا نہ سہی مگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن سے ہم سعی مسلسل سیکھتے ہیں۔ سرسید ہی کی وجہ سے علی گڑھ جیسی بڑی درس گاہ وجود میں آئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سرسید نے اس درس گاہ کو خالص مذہبی نہیں بننے دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں مذہبی اور مسلکی منافرتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اس لیے اس مدرسہ کو دینی اور دنیاوی علوم کا مرکز بنا کر سرسید نے ساری اقوام کو یکجا کیا اور یہی ان کی کامیابی تھی کہ ہندو، سلمان اور سکھ غرض کہ ہر قوم مذہب اور مسلک کا نمائندہ، اس درس گاہ سے مستفید ہوتا رہا۔ اس درس گاہ کو اُن وقتوں میں "مدرسۃ العلوم" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے رشید احمد صدیقی آگے لکھتے ہیں:

> "مدرسۃ العلوم کی اس خصوصیت کو ملک کی تقسیم سے چند سال بیش تر تک بڑی قابلیت، بڑے حوصلے اور خلوص سے بنایا گیا۔ چنانچہ اس ادارے کی تاریخ میں ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، سکھ، قادیانی، پنجابی، بنگالی، دکنی کسی قسم کی ناگواری اور کش مکش کبھی پیدا نہ ہوئی، باوجود اس کے کہ شروع سے آخر تک جتنے مختلف مذاہب و مسلک کے طلبہ اور اساتذہ

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

اس ادارے میں یک جا رہے ہیں، کسی اور ادارے میں خواہ وہ ادارہ حکومت ہی کا کیوں نہ رہا ہو۔ چاہے وہ حکومت بدیسی رہی ہو چاہے قومی!"(۸)

مقصد یہ کہ علی گڑھ کی فضا ایسی تھی کہ تمام لوگ یہاں بھائی بھائی بن کر رہے۔ کبھی بھی عصبیت یا منافرت کا ماحول پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ ہی یہی تھی کہ اس کا قائد ہی ایسا تھا جو سب کو ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ ان کی کتاب میں کسی بھی قوم یا فرقے کے حوالے سے نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

رشید احمد صدیقی سرسید کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑوں میں جن سے زیادہ متاثر رہے وہ ڈاکٹر سید ذاکر حسین کی شخصیت تھی۔ اگرچہ وہ ذہنی لحاظ سے اتنے منفرد نہ تھے مگر ان کے کام اور خدمات کی رشد احمد صدیقی نے ہر سطح پر تعریف ضرور کی ہے۔ وہ انھیں "ذاکر صاحب" ہی کہتے تھے۔ اس شخصیت کے حوالے سے انھوں نے تقریباً گیارہ (۱۱) مضامین لکھے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت رشید صاحب کے لیے روشنی کا مینار تھی۔ وہ ان کی شخصیت سے ہمیشہ مسحور رہے۔ وہ ذاکر صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے جو خدمات انجام دیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھوں نے ایک درس گاہ نہیں بلکہ تہذیب کو تباہ ہونے اور ایک روایت کو رسوا ہونے سے بچالیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ بالخصوص اسی حالت میں جب کہ انھوں نے سیاسی اور مذہبی محرکات کو جن کے طفیل دشوار گزار مراحل بہت جلد اور بڑی آسانی سے طے ہو جایا کرتے ہیں بر سر کار لانے سے قطعاً اجتناب نہیں کیا۔ اس لیے وہ جانتے تھے کہ تہذیب اور اعلا روایات سیاسی محرکات کا نہیں، ریاض، خدمت اور انتظار کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ جس شخص نے جامعہ کے لیے ایک نئی روایت قائم کی اس نے علی گڑھ کی دیرینہ روایت کی حفاظت کی۔"(۹)

علی گڑھ ہی کی ایک اور شخصیت مولانا سہیل صاحب ہیں۔ یہ استاد ہیں اور رشید صاحب کے کولیگ تھے۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ میں نہ صرف یہ کہ اپنے تعلیم مراحل بحسن و خوبی مکمل کیے بلکہ اپنے ماسٹرز کی کامیاب تکمیل اسی درس گاہ میں اپنے ہی شعبہ اردو میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ بعد میں اس شعبہ سے بحیثیت صدر شعبہ اردو ریٹائرڈ بھی ہوئے۔ سہیل صاحب ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے جن سے ان کی بہت گاڑی چھنتی تھی۔ اس حوالے سے وہ سہیل صاحب کے شاعرانہ مزج کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

"انگریزی حکومت، انگریزی طور طریقوں اور خود انگریزوں سے ہمیشہ بیزار رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد مسلمان علما اور شریر انگریزی حکومت نے جو ظلم و ستم ڈھائے اس کا ان پر بہت اثر تھا۔ اس طرح کے واقعات کبھی کبھی بڑے حسرت و الم سے سناتے۔ اردو شاعری کو سیاسی نظمیں، شبلی اور ظفر علی خان نے دیں، لیکن غزل میں سیاسی طنز کے نوک و نشتر سہیل کا عطیہ ہیں۔ مولانا محمد علی کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ سہیل میں یہ بات شبلی سے آئی۔ لیکن نشریت کا التزام، رواداری اور شعوری طور پر جتنا سہیل کی غزلوں میں ہے اتنا نہ ہی شبلی کے ہاں ہے نہ محمد علی یا حسرت کے ہاں۔"(۱۰)

مولانا سہیل خود شاعری کرتے تھے اور وہ بھی غزل میں طنز و نشریت کے حوالے سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا سہیل صاحب کے حوالے سے رشید صاحب کے چار پانچ مضامین ہیں جو ان کے خاکوں کے دونوں مجموعوں "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" میں شامل ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ رشد صاحب نے خاصی طویل عمر پائی اور اپنے اکثر دوستوں کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ وہ ۱۹۶۴ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی سے بحیثیت صدر شعبہ ریٹائرڈ ہوئے۔ بعد میں بھی واسی شعبہ سے کسی نہ کسی حوالے سے منسلک رہے اور ان کو اعزازی طور پر تاحیات اس شعبہ سے خدمات حاصل رہیں۔ بالآخر وہ جنوری ۱۹۷۷ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی قبر بھی ادرس گاہ کے سرکاری مقبرہ میں ہے۔ استادِ محترم ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم (میرے پی ایچ ڈی کے نگران) جب انڈیا گئے تھے تو انھوں نے رشید احمد صدیقی کی قبر پر حاضری دی تھی۔ ان کا قول ہے:

"اقبال کے علاوہ میرے تین عشق رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود۔ یہ تینوں اُسلوب اور اندازِ بیان میں اقبال کے پیروکار ہیں۔"(۱۱)

رشید احمد صدیقی کی قبر پر حاضری کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

"رشید احمد صدیقی کی قبر یونیورسٹی ہی کے احاطے میں ہے۔ یہ کہ ہم نے اُن کی قبر کی چند پتیاں توڑیں تو ان میں ایک خاص قسم کی خوشبو پاتے۔ باقی قبروں پر نہ تو اُس طرح کے پھول تھے نہ ہی ویسی پتیاں۔ یہ بات یقیناً حیران کُن تھی۔"(۱۲)

رشید احمد صدیقی اپنی آپ بیتی "آشفتہ بیانی میری" میں اپنی کرکٹ اور ہاکی سے خصوصی دلچسپیوں کا بھی خصوصی طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی وہ علی گڑھ ہی کے طلبا کے سپورٹس مین سپرٹ کو داد و تحسین

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

دیتے ہیں۔ یعنی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو وہ علی گڑھ ہی کو پیمانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں علی گڑھ سے بہتر کوئی بھی معیارِ زندگی نہیں۔ کھیل کے ساتھ اپنی دلچسپی کے حوالے سے اُن کے الفاظ یہ ہیں:

> اچھا کھلاڑی عموماً معقول ہوتا ہے۔ گو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض کھلاڑی حفیف الحرکات بھی پائے گئے ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ کھلاڑی اکثر قابلِ اعتبار ہوتا ہے، بالخصوص کرکٹ کا کھلاڑی۔"(۱۳)

مزکورہ اقتابس میں رشید صاحب کا یہ خیال محال حقیقت ہے کہ کرکٹ کا کھلاڑی قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ حالاں کہ کرکٹ کے بارے میں آج کل یہ مقولہ عام ہے:

"Cricket by chance and Hockey by dance"

یعنی کرکٹ میں کسی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیوں کہ یہ چانس کا کھیل ہے نہ کہ اعتبار کا۔ اس کھیل کا کوئی بھرسہ نہیں۔ آج کل کوئی ٹیم ٹیسٹ میں پورا دن ۲۰۰ کا اسکور بھی نہیں کر پاتی جب کہ یہی ٹیم ٹی ٹونٹی کرکٹ میں محض بیس اوور میں ۲۲۰ اسکور بآسانی کر لیتی ہے۔ اسی طرح ایک ٹیم (جیسی پاکستانی ٹیم) ٹی ٹونٹی میں ۲۰۰۹ء میں چیمپیئن بن گئی لیکن اگلے ہی سال بنگلہ دیش جیسی بے بی ٹیم سے ۰۔۳ سے مقابلہ ہار گئی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ "کرکٹ بائی چانس"۔ شاید رشید احمد صدیقی کے دور میں کرکٹ کا کھیل قابلِ اعتبار ہوتا ہو۔

رشید احمد صدیقی علم و ادب کے شاہ سوار رہے ہیں اس لیے وہ شعر و سخن کے نشیب و فراز پر مستقل نظر رکھتے ہوتے ہیں۔ شعر و سخن میں مشاعرے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہی مشاعرے شاعری کو فروغ دینے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں ہی کی وجہ سے شاعروں کے ہاں کا ماحول گرم رہتا ہے اور اس سے شاعر کی قابلیت کا پتا چلتا ہے۔اس حوالے سے رشید احمد صدیقی علی گڑھ میں مشاعروں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مشاعرے کی علی گڑھ میں اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایات سے بھی۔ یہی بات کم و بیش ان مشاعروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مشاعروں کا جتنا چرچا پہلے تھا اس سے کہیں زیادہ اب ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کو ہر طبقے میں کس درجہ قبول عام نصیب ہے اور مذہبی تقاریب کے بعد اردو مشاعروں کے

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

لیے عام ہندوستانیوں کے دلوں میں بلا قید مذہب و ملت کتنی وسعت ہے۔ مشاعروں کی روایت عرب سے ایران ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ اس کو جتنی ترقی اور شہرت یہاں نصیب ہوئی شاید خود عرب و ایران میں نہ ہوئی ہو۔ آج کل مشاعروں کا جو رنگ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے اس سے اکثر یہ بات دل میں آتی ہے کہ جس طرح شعر گوئی اور شعر خوانی عرب کے میلے اور بازاروں سے شروع ہو کر ایران اور ہندوستان کے سلاطین اور امرا کے درباروں تک پہونچی۔ اس طرح وہ اب درباروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچ گئی ہے۔"(۱۴)

رشید احمد صدیقی کا بنیادی حوالہ ادب میں بطور مزاح نگار اور طنز یہ ادیب کا رہا ہے۔ اس حوالے سے ان کی ابتداہی "مضامین رشید" سے ہوئی جو ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو پہلی بار ۱۹۴۱ء میں چھاپا گیا اور اُس نے آتے ہی اُن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ بعد میں ان کی طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا ایک اور مجموعہ "خنداں " بھی منظر عام پر آیا جس سے اُن کے مقام و مرتبے کو مزید دوام حاصل ہوا۔ رشید صاحب اپنے طنز و ظرافت کی اس مشق کی ابتدا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی پارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔ یہی کچی پارک اور ڈائننگ ہال علی گڑھ سے باہر کہیں نصیب ہوئے ہوتے کچھ تعجب نہیں یا تو طنز و ظرافت کی طرف مائل ہی نہ ہوئی یا لکھنے کا وہ انداز میسر نہ آتا جو یہاں آیا۔ اس لیے ان محرکات ہی سے جن کا بہت کچھ مدار ماحول اور مطالعے پر ہوتا ہے۔ ان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ علی گڑھ اور متعلقہ ادارے جن میں ڈائننگ ہال بھی ہے ایک زندہ قوم کی امیدوں اور عزیمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان اداروں میں اگر کوئی خلل راہ پائے گا تو وہ نوجوانوں میں بیزاری کا یا بداطواری پیدا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اصلاح کرانے میں معین ہوگا۔ جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔"(۱۵)

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

ماخذ تحقیقی مجلہ

مذکورہ اقتباس میں بھی رشید صاحب وہی راگ الاپ رہے ہیں کہ میرے طنز و ظرافت کی ابتدا بھی علی گڑھ ہی میں ہوئی۔ دراصل صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ جب ان کا ماسٹر مکمل ہوا تو اسی شعبے میں اُن کے لیے ایک سیٹ رکھی گئی۔ اس حوالے سے ان کی سفارش علامہ اقبال نے بھی کی تھی کہ رشید احمد صدیقی اس سیٹ کے لیے موزوں امیدوار ہیں کیوں کہ وہ اردو نظم و نثر کے موقر نقاد اور مزاح نگار ہیں۔ لیکن اُس وقت علی گڑھ میں ایک قانون نہ تھا کہ کہیں بھی کسی بھی شعبہ میں ملازمت حاصل کرنے کے سے پہلے ایک مقالہ لکھنا پڑتا تھا۔ سو رشید احمد صدیقی کو بھی یہ مقالہ لکھنا پڑا۔ اس مقالے میں انھوں نے طنز و ظرافت کے ارتقا، مغربی ناقدین کے ہاں طنز و ظرافت کے نمونوں، نثر موجودہ دور میں اس کی ادبی اہمیت اجاگر کر دی۔ ان کے مقالے کا عنوان "طنزیات و مضحکات" تھا۔ رشید صاحب نے اس مقالے کو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کرایا اور ناقدین سے داد و تحسین حاصل کی۔ تعلیمی اداروں میں مختلف قسم کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی سطح پر یونینوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ بعض ادبی یونین ہوتی ہیں اور کچھ سیاسی یونین۔ ساتھ ساتھ ہر تعلیمی ادارہ میں یونین ہال بھی ریزرو رکھے جاتے ہیں جو طلبا کی اپنی سرگرمیوں کے طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اسُ دور میں یونین ہال قائم تھا۔ اُس ہال کے بارے میں رشید صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> "کالج کے زمانے میں اور اسی سے کچھ دنوں بعد تک یونین میں کسی مہمان کا خیر مقدم کیا جاتا تو تلطف و تکریم کے اچھے اچھے سے اور زیادہ سے زیادہ کلمات مہمان کے لیے کیے جاتے۔ ان باتوں کا ذکر لطف و احترام سے کیا جاتا جس مہمان کا تعلق خاص ہوتا۔ مہمان کی پذیرائی کا مفہوم ہوتا کہ اس کی عزت اپنی عزت اس کی خوشی اپنی خوشی اس کی خفت اپنی خفت تھی۔ اپنے بارے میں جو کچھ کہتے اس میں انکسار اور وقار ہوتا اور تقریر بہت مختصر ہوتی۔ شریف گھرانوں میں کوئی مہمان آتا ہے تو ہم سب جانتے ہیں کہ مہمان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یونین کا یہ رنگ نظر آنے لگا کہ مہمان کوئی ہو، موقع کچھ ہو، مہمان کا خیر مقدم در مدح گوہر، کے رزمیہ اور جزیہ سے کیا جانے لگا۔"(١٦)

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

رشید احمد صدیقی ایک تہذیبی شعور رکھنے والے ادیب اور نثر نگار تھے۔ انھوں نے اوپر کے اقتباس میں اپنی ذہنی اُپج کے مطابق انکسار اور مروت کا بخوبی ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشرقی اقدار کے کس قدر حامی تھے اور مشرق و مغرب کے تقابلی جائزے میں ہمیشہ مشرق کے ہی حامی رہے۔

رشید صاحب کے ہاں مختلف طریقوں سے طنز و مزاح کے انداز میں مختلف مزاحیہ کرداروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ جیسے شیخ نیازی، خندان، بابو، مولانا سہیل اور غلام حسین صاحب۔ یہ مختلف مزاحیہ کردار ان کی تحریروں میں جابجا اپنا رنگ دکھاتے ہوئے قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "غلام حسین کا ایک مصرف اور تھا۔ آج کل جلسے جلوس کی رونق کا مدار اس پر ہے کہ ہائے ہائے یا زندہ باد کے نعرے کس بے جگری یا بے غیرتی سے لگائے جاتے ہیں۔ غلام حسین کے عہد میں یہ تقریب اس طرح منائی جاتی۔ رات کے وقت کھانے کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس سے آواز بلند ہوئی۔ "غلام حسین" پاس کے بورڈنگ ہاؤس سے اس کا جواب دیا جاتا۔ "بسکٹ والا" پندرہ بیس منٹ تک سوال جواب طرح طرح کے اونچے سروں میں ہوتا رہتا اور پھر بند ہو جاتا۔ دوسرے دن معلوم ہوتا کہ وجہ احتجاج کیا تھی جس کو دور کرنے کے لیے ضروری کاروائی عمل میں لائی جاتی۔
>
> نہ کہیں احتجاج ہوتا، نہ جلوس نکلتا، اس کار خیر میں شریک کرنے کے لیے اسکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی۔"(۱۷)

الغرض یہ آپ بیتی رشید احمد صدیقی کے نثری میلانات اور رجحانات کے حوالے سے اپنی پوری سعی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس آپ بیتی کے ذریعے سے رشید صاحب نے مثنویات سرسید، حالی، نزیر احمد اور شبلی نعمانی کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے دور کے میلانات، عہد کے مزاح، نثر و نظم اور معاشرے کی تصویر کشی کی ہے اور ایک معتبر و موقر نثر نگار کے طور پر اپنا مقام بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی یہ آپ بیتی ہر لحاظ سے مکمل اور مؤثر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۹
۲۔ ایضاً، ص۱۳

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 6, Issue 3, (July to Sep 2025)
https://doi.org/10.47205/makhz.2025(6-III)urdu-16

ماخذ تحقیقی مجلہ

۳۔ ایضاً، ص ۱۸۔۱۹

۴۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۶۔ ایضاً، ص ۳۷۔۳۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹

۸۔ ایضاً، ص ۴۰۔۴۱

۹۔ ایضاً، ص ۴۶۔۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۱۔ انٹرویو، ڈاکٹر صابر کلوروی، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، ستمبر ۲۰۰۷ء

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، ص ۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۶۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، ص ۹۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔۱۳۱